مسلم دنیا کی تفہیم: نیا امریکی بحران

جان ایل اسپوزیٹو*

ترجمہ: سید راشد بخاری

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون میں ۱۱ ستمبر کو ہونے والے دھماکوں کو بعض لوگ اکیسویں صدی میں اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان نئے تصادم سے تعبیر کر رہے ہیں۔ کچھ افراد اسے اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان اور کچھ اسے انتہا پسند اسلام اور ''ہمارے طرزِ زندگی'' کے درمیان تصادم کا نام دے رہے ہیں۔ کیا واقعی جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اسے اسلام اور مغرب یا تہذیب یافتہ دنیا اور عالمی دہشت گردی کے درمیان تصادم کہا جا سکتا ہے؟

میڈیا کے تبصروں، تجزیوں، پالیسی سازوں اور حکومتی اہلکاروں کے تبصروں اور گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اسلام کے مذہب اور تاریخ کے بارے میں کس قدر کم معلومات رکھتے ہیں۔ عموماً اسلام کو میڈیا کی چیختی چلاتی سرخیوں اور رپورٹنگ کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح ایک محدود سی (اکثر انتہا پسند) اقلیت، اکثریت کی ذہن سازی کرتی ہے۔ عام رجحان یہ ہے کہ تمام اسلامی تحریکات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، متشدد ہوں یا غیر متشدد، اسلامی بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔

اسلام کی جو محدود عسکری اور قبائلی تعبیر، خواتین پر پابندیوں کے ذریعے اور بدھا کے مجسمے گرا کر طالبان کی ہے، اس کا اسلامی عقائد و قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلم دنیا کی حکومتوں اور اکثر مذہبی قائدین نے ان کے تصورِ اسلام پر تنقید کی ہے۔ اسی طرح اسامہ اور القائدہ بھی اسلام کی اتنی ہی نمائندگی کرتے ہیں جتنی اسقاطِ حمل کے شفاخانوں کو تباہ کرنے والے عیسائی عیسائیت کی یا اسحاق رابن کو قتل کرنے

*John L. Esposito, "America's New Crises: Understanding the Muslim World", /http://www.islam-online.net/

والے یہودی بنیاد پرست اور اسرائیل میں مسجد میں جمعہ کی نماز کے دوران مسلمانوں کا قتل عام کرنے والے ڈاکٹر بروک گولڈسٹین یہودیت کی کرتے ہیں۔ تاہم ایک خطرناک انتہا پسند اقلیت ضرور موجود ہے جو مصر سے جنوبی فلپائن تک خود اپنے معاشروں کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔

مسلم دنیا اور احیائے اسلام

اسلام کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے ایمان اور عقائد کی مختلف تعبیرات کو سمجھنا ہی کافی نہیں بلکہ مسلم سیاست میں اسلام آج جو مختلف کردار ادا کر رہا ہے انہیں سمجھنا بھی ضروری ہے۔ آج دنیا میں قریباً سوا ارب مسلمان ہیں جو افریقہ سے ایشیاء تک ۵۶ مسلم ممالک اور یورپ اور امریکہ میں بستے ہیں، جہاں اسلام بالترتیب دوسرا اور تیسرا بڑا مذہب ہے۔ مسلم ممالک کی حکومتوں میں بادشاہتیں بھی ہیں، جمہوریائیں بھی ہیں، مذہبی بھی ہیں اور لادین ہیں۔ ان میں امریکہ کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔

ایران میں اسلامی انقلاب (۷۹-۱۹۷۸ء) کے بعد سے ایران، سوڈان اور افغانستان میں اسلام کی دعویدار (اسلامی) حکومتیں قائم ہوئیں جبکہ سعودی عرب اور پاکستان دو پہلے سے موجود اسلامی حکومتیں ان کے علاوہ ہیں۔ تاہم انہیں آسانی سے بنیاد پرست نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حکومتوں کی نوعیت اور مغرب سے ان کے تعلقات کے لحاظ سے ان میں گہرے فرق پائے جاتے ہیں۔ سعودیہ میں بادشاہت ہے، سوڈان اور پاکستان میں فوجی حکمران ہیں۔ ایران میں علماء کی حکومت ہے اور افغانستان کے طالبان مذہبی مدارس کے سابق طلباء ہیں۔ ان میں سے سعودی عرب اور پاکستان عام طور پر امریکہ کے اتحادیوں میں شمار ہوتے ہیں اور سوڈان، ایران اور افغانستان دشمنوں میں۔

گزشتہ دو عشروں میں شمالی افریقہ سے جنوب مشرقی ایشیا تک وسیع سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے اسلام کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ حکمران اپنی حکومتوں کو جائز بنانے اور مقبولیت کے حصول کے لیے اسلام کا نام لیتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی سماجی تنظیمیں وجود میں آئی ہیں جو تعلیمی، طبی، قانونی اور سماجی خدمات کے لیے کام کر رہی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اسلامی سیاسی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں جن میں قدامت پسند، اصلاح پسند اور انتہا پسند سبھی تنظیمیں شامل ہیں۔

مختلف حکومتوں نے سیاست میں مذہب کے عمل دخل پر مختلف طرح کے ردِعمل ظاہر کیے ہیں۔ شمالی افریقہ میں مراکش کے شاہ نے اپنے اسلامی شجرہ نسب کو جو پیغمبر محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] سے جا کر ملتا ہے، ایک معتدل اصلاحی ایجنڈے کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں پارلیمانی انتخابات بھی شامل ہیں۔ تیونس اور الجزائر نے زیادہ سیکولر راستوں کا انتخاب کیا ہے۔ تیونس کے بن علی نے اسلام پسند پارٹی النہضہ کو کچل کر، جو قومی انتخابات میں واحد حزبِ اختلاف کے طور پر سامنے آئی تھی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔ الجزائر ایک عشرہ پہلے شروع ہونے والی خانہ جنگی سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ خانہ جنگی اس وقت شروع ہوئی تھی جب الجزائری فوج نے جمہوری طور پر منتخب شدہ اسلامک سالویشن فرنٹ (FIS) کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے مداخلت کی تھی۔ اسلامی فرنٹ نے بلدیاتی اور پارلیمانی انتخابات بھاری اکثریت سے جیت لیے تھے۔ الجزائر میں تشدد نے فوج میں انتہاپسندوں کو اسلامی انتہاپسندوں کے سامنے لا کھڑا کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ جانیں ضائع ہو گئیں۔

عراق اور مصر جیسی پرانی اشترا کی عرب ریاستوں نے مختلف راستے اختیار کیے۔ صدام حسین کی سیکولر عراقی حکومت نے خود اپنی آبادی پر ظلم کیے، مشرق وسطیٰ کی حکومتوں کے لیے خطرات کھڑے کیے اور اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے مغرب کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ مصر میں حسنی مبارک نے جو امریکہ کے اتحادی ہیں، جارح انتہاپسند اسلامی گروہوں پر بے انتہا طاقت کا استعمال کر کے انہیں دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مبارک حکومت نے اخوان المسلمون سمیت اپنے ناقدین، پیشہ ورانہ تنظیموں اور میڈیا پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے بے جا سختی کی۔ اخوان المسلمون گزشتہ کئی دہائیوں سے عدم تشدد کا راستہ اختیار کر چکی تھی۔

اسلام اور مغرب ـــــ پہلو بہ پہلو

مغربی تہذیب سے تقابل میں اسلام کو اکثر آزاد جمہوری معیارات (ideals) کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کچھ لوگ اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان تصادم کی بات کرتے ہیں۔ سرمایہ داری اپنی مقامی شکلوں میں بھی اور مغرب سے متاثرہ شکلوں میں بھی مسلم دنیا میں

موجود ہے۔ مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ مغرب کی اقتصادی اجارہ داری اور اس کے مضمرات کا ہے۔ مغربی اجارہ داری کے یہ نقصانات صرف مسلم دنیا کے لیے ہی نہیں بلکہ عمومی طور پر ''جنوب'' کے تمام ممالک کے لیے ہیں۔ درحقیقت مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے اکثر عناصر سے اسلام کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ خود [حضرت] محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کے قریبی رفقا میں خوش حال اور دولت مند تاجر تھے اور آپ بھی اپنے گزارے کے لیے مالی اور تجارتی امور میں شریک رہے ہیں۔

قرآن، حدیث اور حضور [صلی اللہ علیہ وسلم] کی روایات [اسوۂ حسنہ] سے بھی نجی جائیداد رکھنے اور تجارت اور کامرس کی اجازت کی تصدیق موجود ہے۔ درحقیقت اسلامی قانون معاشی ضابطہ ہائے کار کی نہایت نفیس شکل تشکیل دیتا ہے۔ دنیا بھر میں مسجدیں، جیسے دمشق کی مسجد امیہ اور قاہرہ اور تہران کی شاندار مسجدیں اکثر بڑے بڑے بازوں کے ساتھ جڑیں ہوئی ہیں۔ تاجر اور کاروباری طبقہ معاشرے کا سب سے کامیاب طبقہ تھا اور اپنے عقیدے کی توسیع واشاعت کا ذمہ دار تھا۔

شائد اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان ناموافقت بتانے والوں کے لیے بہترین جواب یہی ہے کہ وہ ان لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں پر نظر ڈالیں جو امریکہ اور یورپ کے وسط میں رہتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ بہت سے یہاں اس لیے آئے ہیں کہ یہاں موجود آزادی اور مواقع سے فائدہ اٹھائیں جو ہمارا معاشی اور سیاسی نظام مہیا کرتا ہے۔ اپنے سے پہلے کی مذہبی اور نسلی اقلیتوں کی طرح یہ بھی اپنی شناخت اور مکمل انضمام جیسے مسائل سے نمٹنے کے لیے کوششیں کرتے ہیں لیکن انہیں ہمارے نظام سے فائدہ اٹھانے کے لیے مکمل مواقع حاصل ہیں۔ یہ حقیقت کہ ان کے مذہب کے کچھ افراد نے تعلیمات کو مسخ کر دیا ہے اور دہشت گردی کے مرتکب ہوئے ہیں قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ قانون کے تحت حاصل ان کے حقوق سے انہیں محروم کر دیا جائے اور اس مذہبی برداشت کو آزمایا جائے جس کی بنیاد پر ہمارا سیاسی نظام قائم ہے۔

''وہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں''؟

یہ صرف سہل انگاری ہے اگر کہا جائے کہ امریکہ مخالف جذبات، کم عقلی، احسان فراموشی، ہماری

کامیابی سے حسد اور ہمارے ''طرزِ زندگی'' سے نفرت کی وجہ سے ہیں۔ اب جب ہم اس الجھن میں ہیں کہ ''وہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں'' تو ہمیں اس ادراک کی ضرورت بھی ہے کہ وہ ہمیں ہم سے زیادہ دیکھتے ہیں۔ امریکہ مخالف جذبات کا سبب انتہا پسندوں کی اندھی نفرت یا مذہبی جذبہ نہیں ہے بلکہ اس کے پسِ پردہ مسلم دنیا میں امریکی پالیسیوں پر مایوسی اور غم وغصہ بھی ہے۔ ماضی کے برخلاف آج بین الاقوامی عرب اور مسلم میڈیا محض مغربی رپورٹروں اور چینلز پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اپنے مقبوضہ علاقوں میں تشدد اور غارت گری کی کوریج روزانہ کی بنیاد پر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ آج کتنے فلسطینی مارے گئے اور کتنا جانی نقصان ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان ایف سولہ طیاروں اور اپیک ہیلی کاپٹروں کا مقبوضہ علاقوں میں شہریوں پر استعمال بھی دیکھتے ہیں جو امریکہ نے اسرائیل کو دیے ہیں۔

مغربی کنارے اور غازا میں اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون کی بے رحمانہ پالیسیوں پر امریکہ کا اسرائیل کے لیے نہایت رحم دلانہ رویہ، امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی غیر مشروط حمایت ـــــ جس کا اظہار اسرائیل کو دی جانے والی امداد، اقوام متحدہ میں اسرائیل کے حق میں امریکہ کی ووٹنگ کے ریکارڈ اور انتظامی اور خارجہ اہلکاروں کے بیانات سے ہوتا ہے ـــــ یہ سب جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے کافی ہیں۔ مزید براں، حق خودارادیت، جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے مغربی دعووں کو منافقانہ دوہرے معیار کے حامل سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب امریکی پالیسیوں سے ان دعووں کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ لاکھ عراقی بچوں پر امریکی پابندیوں کے اثرات، پاکستان پر پابندیاں جبکہ دوسری طرف بھارت اور اسرائیل کو ایٹمی پیش رفت سے روکنے میں مکمل ناکامی۔ کوسووا میں ہمارا اخلاقی ارادہ جتنا نمایاں تھا چیچنیا اور کشمیر کے تنازعات میں ہماری پالیسی میں وہ بالکل غائب ہے۔ جیسے ایک مقامی امریکی نومسلم اور سابق حکومتی مشیر نے لکھا ہے: ''چیچنیا کی نسل کش تباہی میں منفرد امریکی سازش، کشمیر پر بھارتی وحشیانہ قبضہ کی خاموش حمایت، بوسنیا کی نسلی تطہیر میں اس کا دھیما پن، اور کوسووا میں نسلی تطہیر روکنے کے لیے شدید امریکی اصرار، ان سب نے دہشت گردوں کی ذہنیت کو تشکیل دیا ہے جو ساری دنیا میں پھیل رہی ہے''۔

دہشت گردی پر ردِعمل

عالمی دہشت گردی کے خطرہ کے ردعمل میں ہمارے قائدین کے لیے یہ مشکل مگر ضروری ہے کہ وہ انتقام سے مغلوب نہ ہوتے ہوئے قیادت کریں۔ عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ داخلی سطح پر اہم اصولوں اور اقدار کو پسِ پشت ڈال دیا جائے یا مسلم دنیا کے مستبد حکمرانوں کو کھلی چھوٹ مل جائے کہ وہ قانون کی حکمرانی اور شہری معاشرے کا دائرہ مزید تنگ کر سکیں یا تشدد سے گریزاں حزب اختلاف کو کچل کر رکھ دیں۔ نہ ہی اسے اسرائیل-فلسطین تنازعہ پر زیادہ متوازن پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت پر اثر انداز ہونا چاہیے۔ فوجی کارروائی، سلامتی کے لیے اقدامات، دہشت گردی کے خلاف قانون سازی اور خارجہ پالیسی، تمام معاملات میں امریکی اور یورپی ردِعمل مناسب اور موزوں ہونا چاہیے۔ گیارہ ستمبر کی دہشت گردی کے ذمہ داران کو فوری انصاف کے کٹہرے میں لاتے ہوئے اور ان کے ٹھکانوں اور بنیادوں کو تباہ کرتے ہوئے ماضی کی غلطیوں کو ضرور سامنے رکھا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جرم کی شہادتیں اور ان کے دہشت گردوں سے تعلق واضح ہوں اور حملے غیر ترجیحی، غیر امتیازی اور وسیع پیمانے پر (wide ranging) نہ ہوں بلکہ مخصوص (focused) ہوں۔ حد سے بڑھے ہوئے ردِعمل سے صرف مشرقِ وسطیٰ اور وسیع مسلم دنیا میں ہی جوابی کارروائیوں کا خطرہ نہیں بلکہ امریکی اور یورپی مسلمان شہریوں میں بھی غم وغصہ اور ردِعمل شدید ہو سکتا ہے۔ اس طرح بہت سوں کے نیک ارادے اور حمایت زائل ہو جائے گی اور دوبارہ اسی عالمی طاقت کا امیج ابھرے گا جو خود کو بین الاقوامی قانون سے بالاتر سمجھتی ہے۔

اگر متذکرہ بالا خارجہ پالیسی کے مسائل پر موثر انداز میں خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی تو ان سے نفرت اور انتہا پسندی جنم لیتی رہے گی اور دنیا کے بن لادنوں کی فوج میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ چنانچہ ناگزیر ہے کہ طویل المیعاد کے ساتھ ساتھ ایک ایسی قلیل المیعاد حکمت عملی اختیار کی جائے جو امریکی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کی بنیاد پر ہو۔ ہمارے لیے چیلنج یہی ہے کہ ہم ایسی پالیسیاں، حکمت عملیاں اور طریقہ ہائے کار اپنائیں جن سے ان تنازعات اور تصادمات کو ختم کرنے میں مدد ملے جو بصورت دیگر ہماری آئندہ نسلوں کو درپیش ہوں گے۔

[جان ایل اسپوزیٹو جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں مذہب اور بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ میں پروفیسر ہیں اور والش سکول آف فارن سروس میں مسلم عیسائی افہام و تفہیم کے ادارے Centre for Muslim-Christian Understanding کے بانی منتظم (ڈائریکٹر) ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے ایک The Islamic Threat: Myth or Reality (آکسفورڈ پریس) ہے۔]